نازیہ کنول نازی

بھوک

نازیہ کنول نازی

زندگی صرف محبت نہیں، کچھ اور بھی ہے
زلف و رخسار کی جنت نہیں، کچھ اور بھی ہے
بھوک و افلاس کی ماری ہوئی اس دنیا میں
عشق ہی اک حقیقت نہیں، کچھ اور بھی ہے

اسے کہنا
کتابوں میں جو سوکھے پھول رکھے تھے
وہ اس کے لوٹ آنے کا ہمیں یقین دلاتے ہیں
اسے کہنا کہ اس کی جھیل سی آنکھیں
کسی منظر پہ چھا جائیں تو سب منظر
یونہی پھر بھیگ جاتے ہیں
اسے کہنا کہ ٹھنڈی برف پر کوئی کسی کے ساتھ چلتا ہے
تو قدموں کے نشان پر سے
اسی کے لوٹ آنے کا نشاں دل پر بناتے ہیں
اسے کہنا کہ اس کی بھیگی آنکھوں کا وہ آنسو
ستارے کی طرح اب بھی ہمیں شب بھر جگاتا ہے
اسے کہنا کہ بارش کھڑکیوں پر اس کے آنسو پینٹ
کرتی ہے
اسی کا نام لکھتی ہے اسے ہی گنگناتی ہے
اسے کہنا کہ خوشبو، چاندنی، تارے
صباء رستے، گھٹا، کاجل
محبت چاندنی، شبنم، ہوائیں، رات دن بادل
سبھی ناراض ہیں، ہم سے
اسے کہنا کہ جدائی کے درختوں پر جو سوکھی ٹہنیاں ہیں
وہ ساری برف کی چادر میں کب کی ڈھک چکی ہیں
اور ان شاخوں پر یادوں کے جو پتے تھے
سنہری ہوگئے ہیں
اسے کہنا کہ لوٹ آئے دسمبر سو گیا ہے

''ماں...... بھوک لگی ہے۔''

شام کے دھند لکے گہرے ہو رہے تھے چھوٹے سے کچے صحن میں لگے سکھ چین کے پیڑ پر بیٹھی چڑیوں نے اپنے اپنے گھونسلوں کو لوٹنا شروع کردیا تھا۔ جب اس نے نقاہت سے آنکھیں کھول کر خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے دیکھا۔ نظر سے کچھ ہی فاصلے پر اس کی چارپائی کے قریب اس کی آٹھ سالہ بیٹی عائشہ گم صم بیٹھی تھی۔ جبکہ نیچے فرش پر اس کا پانچ سالہ بیٹا حمزہ اور تین سالہ بیٹا طلحہٰ خالی پیٹ لیے حسرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے

بھوک پر احتجاج کر رہے تھے۔

اسے آنکھیں کھولتے دیکھ کر ان تینوں کے چہروں پر کیسی الوہی سی چمک آئی تھی۔ عبیرہ کا دل کٹ کر رہ گیا۔ کس قدر لاچاری سے وہ ٹوٹی پھوٹی چارپائی پر لیٹی اپنے معصوم جگر گوشوں کے بھوک سے اترے ہوئے چہرے دیکھ رہی تھی۔ مارے بے بسی کے اس کی آنکھیں دکھ سے بھر آئیں۔

دل جیسے درد کی شدت سے پھٹ رہا تھا۔ جبکہ تین روزہ بخار نے اس کی ساری ہمت ہی نچوڑ لی تھی۔ آنسو چھپانے کی کوشش کرتیں آنکھیں ضبط سے سرخ ہو رہی تھیں اس وقت اس میں اتنی سی ہمت بھی نہیں تھی کہ وہ اٹھ کر اپنے لاڈلوں کو سینے سے لگا لیتی۔ انہیں بہلانے کے لیے تسلی کے دو بول ہی سنا دیتی وہ بس رو سکتی تھی اور رو رہی تھی۔

"امی آپ رو کیوں رہی ہیں، کیا آپ کو بھی بھوک لگی ہے۔" آٹھ سالہ حمزہ نے اس کے آنسو دیکھ لیے تھے۔ عبیرہ نے ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ آہستہ سے نفی میں سر ہلا دیا تبھی اس کی بیٹی عائشہ اس کا سر دباتے ہوئے بولی تھی۔

"مجھے بھی بھوک نہیں لگی امی، بس آپ جلدی سے ٹھیک ہو جائیں۔"

دو دن سے پانی پر گزارا کرتی اس کی معصوم بیٹی نے کتنا حوصلہ دکھایا تھا' وہ تڑپ کر رہ گئی۔ بمشکل ہاتھ بڑھا کر اس نے اس کے ننھے سے ہاتھ کا بوسہ لیا تبھی وہ بولی تھی۔

"امی میں کل نکڑ والے ڈاکٹر انکل کی دکان پر گئی تھی آپ کے لیے دوا لینے مگر انکل نے دوا نہیں دی۔ ڈانٹ کر دکان سے نکال دیا اور کہا جب تک تمہاری ماں میری بات نہیں مانتی میں دوا نہیں دوں گا امی پلیز آپ ان کی بات مان لیں پلیز۔"

ہر حقیقت سے بے خبر چھوٹی سی معصوم بچی دو دن کے بعد ماں کو ہوش میں دیکھ کر بتانا نہیں بھولی تھی۔ عبیرہ کا سارا بدن سلگ اٹھا جبکہ آنکھیں اپنی اس درجہ بے بسی پر پھر سے جھلملائی تھیں تبھی اس کا پانچ سالہ بیٹا طلحہٰ اس کے پاس آتے ہوئے بولا تھا۔

"ماں، میں نے کل ڈاکٹر انکل کو کہا تھا کہ آپ میری ماں کو ٹھیک کر دو، میں بڑا ہو کر آپ کے سارے پیسے اتار دوں گا مگر انہوں نے کہا کہ تمہاری ماں اب کبھی ٹھیک نہیں ہوگی کیا آپ اب کبھی ٹھیک نہیں ہوں گی؟" ننھے فرشتے کے معصوم لہجے میں کتنا درد اور مایوسی تھی اس نے روتے ہوئے چپ چاپ ہاتھ بڑھا کر اسے اپنے سینے میں بھینچ لیا تبھی عائشہ بولی تھی۔

"حمزہ، طلحہٰ اللہ سے دعا کرو اللہ ہماری امی کو جلدی سے ٹھیک کر دے پھر امی ہم سب کے لیے بہت مزے کا کھانا لائیں گی۔" اس کے کہنے کی دیر تھی کہ حمزہ اور طلحہٰ نے فوراً دعا کے لیے ہاتھ اٹھا لیے۔

"اللہ ہماری امی کو جلدی سے ٹھیک کر دو ہمیں بہت بھوک لگی ہے۔ ہماری امی کے سوا ہمارا دنیا میں اور کوئی نہیں بابا بھی نہیں۔" دعا کیا تھی جیسے کوئی فریاد تھی عبیرہ تپتے وجود کے ساتھ اوپر نیلے آسمان کی طرف نگاہیں اٹھاتے ہوئے سسک پڑی۔

"اے اللہ پاک تو جانتا ہے میرے بچے دو دن سے بھوکے ہیں اور میں انہیں روٹی کا ایک نوالا نہیں کھلا سکتی، میرے مالک میرے حال پر رحم کر مجھے ہمت دے تاکہ میں اٹھ کر اپنے بچوں کے لیے کچھ لا سکوں۔" سمندر ہوتی آنکھوں کے آنسو پیتے ہوئے دل ہی دل میں اس نے شدت سے دعا کی اور رو پڑی۔

تین دن کے بخار نے اس کا حلق خشک کر دیا تھا مگر آنسوؤں کے دریا کی روانی میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔

❀......✿......❀

وقت کتنی تیزی سے بدل گیا تھا۔

آج سے فقط دس سال قبل زندگی کتنی خوب صورت تھی۔ رنگین تتلیوں کی مانند محبتوں کی فضاؤں میں اڑتے ہوئے اسے کبھی زندگی کی تلخیوں کا احساس بھی نہیں ہوا تھا۔ والدین، عزیز رشتہ دار دوست احباب

سب اس پر جان چھڑکتے تھے آخر کو وہ اپنے ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھی۔ خوب صورت چہرے پر بڑی بڑی جھیل سی آنکھیں شانوں سے ڈھلکتے سیاہ ریشمی بال سرخ وسفید دمکتی رنگت موتیوں سے سفید دانت وہ واقعی اس قابل تھی کہ اسے سراہا جاتا۔

حسن اور اچھی قسمت کے ساتھ ساتھ قدرت نے اسے دولت کی فراوانی سے بھی نوازا تھا۔ اس کے بابا کا تعلق چمن سے تھا جہاں ان کے مختلف باغات تھے۔ اس وقت اس کے نزدیک دولت کی قطعی کوئی وقعت نہ تھی۔ اسے پڑھنے کا شوق تھا اور اس کے جان لٹانے والے بابا نے بنا کسی کی کوئی پروا کیے اپنی بیٹی کے اس شوق کو پورا کیا تھا اسے کالج لے جانے اور کالج سے لانے کے لیے ایک اسپیشل وین کالج والوں کی طرف سے پابند تھی جس کی ڈرائیو کے فرائض جس نوجوان کے سپرد کیے گئے اس کا نام حدید تھا اور حدید کا گھرانہ فقط ایک سال قبل سیلاب کی نذر ہو گیا تھا۔

منہ زور پانی کی لہروں میں نہ صرف اس کے رشتے دار اور گھر کا سازو سامان بہہ گیا بلکہ اس کے سارے خواب ساری تمنائیں اعلیٰ تعلیم کے ارادے سب بہہ گئے۔ بہت مایوسی اور دلگرفتی کے عالم میں اس نے عبیرہ کے کالج میں ڈرائیور کی حیثیت سے نوکری کی تھی۔

ہر روز ٹھیک سوا آٹھ بجے وہ عبیرہ اور اس کی فرینڈز کو ان کے گھروں سے پک کرتا اور پھر چھٹی کے بعد ایک ایک کر کے ڈراپ کر دیتا۔ عبیرہ کی طرح حدید بھی اپنی وجاہت اور خوب صورتی میں اپنی مثال آپ تھا۔ خوب صورت غلافی آنکھوں میں ٹھہری عجیب سی اداسی کے ساتھ اس کے بھاری مونچھوں تلے دبے گداز لب ہمیشہ چپ کا قفل لگائے۔ عبیرہ کے دل کا چین لوٹ گئے۔ دل ہی دل میں وہ کب اس پر فدا ہو گئی اسے خبر ہی نہ ہوئی۔

کالج سے واپسی پر حدید سب سے پہلے اسے ڈراپ کرتا تھا کیونکہ اس کا گھر سب سے پہلے آتا تھا جبکہ صبح پک کرتے وقت وہ سب سے آخر میں اسے پک کرتا جس پر وہ جل جل کر کباب بن جاتی تھی۔ مگر اسے پروا ہی کہاں تھی۔

کالج سے واپسی پر اس کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھے کیونکہ اسے اس کے پہلو میں سفر کرنا بہت اچھا لگتا تھا۔ مگر جس روز اس کی کوئی دوست اس کے پہلو میں بیٹھ جاتی اس روز کالج سے گھر تک کا فاصلہ اس کے لیے جیسے عذاب بن جاتا تھا بن پانی کی مچھلی کی طرح وہ تڑپتی رہ جاتی تھی اور اس کی اس تڑپ سے وہ یقیناً بے خبر نہیں تھا تبھی تو اکثر اس کے تپتے چہرے کی سرخی دیکھ کر ایک مبہم سی مسکراہٹ اس کے گداز لبوں پر بکھر جاتی تھی۔

ایک بار طبیعت کی خرابی کے باعث وہ تین دن تک ڈیوٹی پر نہ آسکا تو عبیرہ کی جان لبوں پر آ گئی ساری ساری رات وہ جاگ کر بے چینی سے ٹہلتی رہتی اور اسے سوچتی رہتی۔ چوتھے روز چھٹی کے وقت اس نے شدت دل سے دعا کی کہ وہ اسے نظر آ جائے اور اس کی دعا قبول ہو گئی۔

کالج گیٹ کے قریب شیشم کے پیڑ تلے کھڑا وہ کسی سے بات کر رہا تھا عبیرہ کی آنکھیں اسے دیکھ کر خوشی سے بھیگ گئیں تبھی شاید اس روز وہ اس پر غصہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔

”آپ تین روز کیوں نہیں آئے۔ آپ کو معلوم ہے آپ کی غیر حاضری کی وجہ سے ہمیں کتنی کوفت کا سامنا کرنا پڑا؟“

اس وقت اس کا بس نہ چلتا تھا کہ وہ اس کا گریبان تھام لیتی اور اس سے اپنے ایک ایک لمحے کی بے قراری کا حساب لیتی مگر اس نے اس کے غصے کے مطلق پروا نہ کی۔

”سوری، میں بیمار تھا میں نے کالج کی انتظامیہ کو خبر کر دی تھی۔“ زرا کی زرا نگاہیں اٹھا کر اس نے اس کی سمت دیکھا اور گاڑی اسٹارٹ کر دی تھی۔ عبیرہ صبر کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔ کتنی خواہش تھی اس کی کہ وہ کبھی نظر بھر کر اس کے حسین روپ کو دیکھے اس کے لیے بے قرار ہو، اس کی قربت کے بہانے تلاشے مگر ایسا کچھ نہیں ہوا

تھا۔ اس کی محبت اب آہستہ آہستہ جنون کی شکل اختیار کرتی جارہی تھی، وہ ذراسی بے رخی جتاتا عبیرہ گھر آ کر اپنے کمرے کی چیزوں پر غصہ اتارتی۔ بعض اوقات وہ خود کو بھی نقصان پہنچانے سے دریغ نہیں کرتی تھی کہ اپنے رشتوں اوران کی محبت کے معاملے میں وہ ایسی ہی جذباتی تھی اسے اپنے اور حدید کی حیثیت کا بہت اچھی طرح سے پتا تھا۔ محبت کی ہولنا کیوں سے بھی وہ بے خبر نہیں تھی۔ مگر پھر بھی حدید عبدالجبار کی محبت کے طلسم نے اسے جیسے جکڑ لیا تھا۔ وہ اپنی آنکھوں کو اس کے خواب دیکھنے سے باز نہیں رکھ پائی تھی۔ حدید عبدالجبار کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا اور وہ خود کو اس معاملے میں قطعی بے بس پارہی تھی۔

❀ ❀ ❀
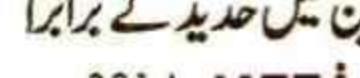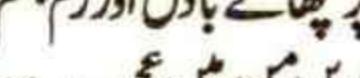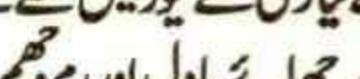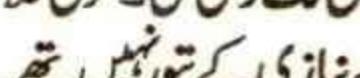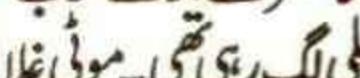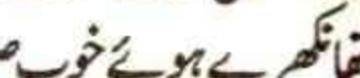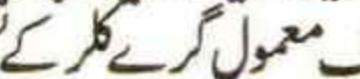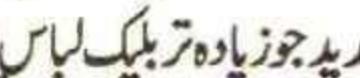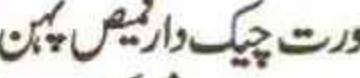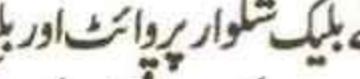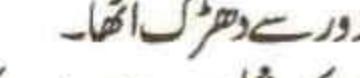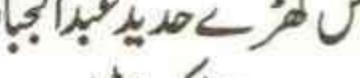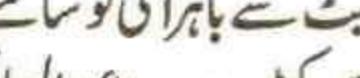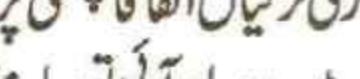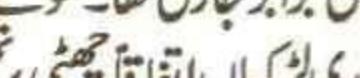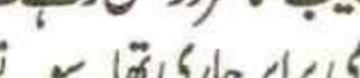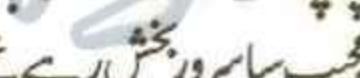
اس روز موسم بہت خوب صورت تھا۔

نیلے آسمان پر چھائے کالے گھنگھور بادل اور پرکیف ہوائیں ماحول کو عجیب سا سرور بخش رہے تھے ہلکی ہلکی بوندا باندی کا سلسلہ بھی برابر جاری تھا۔ سونے پر سہاگہ اس کے ساتھ والی ساری لڑکیاں اتفاقاً چھٹی پر تھیں وہ بے حد مسرور سی کالج گیٹ سے باہر آئی تو سامنے شیشم کے پیڑ تلے وین کے پاس کھڑے حدید عبدالجبار کو دیکھ کر بے ساختہ اس کا دل زور سے دھڑک اٹھا۔

آج اس نے بلیک شلوار پر وائٹ اور بلیک کلر کے کمبی نیشن کی خوب صورت چیک دار قمیص پہن رکھی تھی۔ گلے میں معمول کی مانند سوٹ سے میچ کرتا دوپٹا جھول رہا تھا۔ اس کے برعکس حدید جو زیادہ تر بلیک لباس میں ہی دکھائی دیتا تھا آج خلاف معمول گرے کلر کے نفیس سے کرتا شلوار میں ملبوس تھا نکھرے ہوئے خوب صورت چہرے پر تازہ شیو بڑی بھلی لگ رہی تھی۔ موٹی غلافی آنکھوں کی سرخی میں آج بے نیازی کے تیور نہیں تھے۔

نیلے آسمان پر چھائے بادل اور رم جھم برستی بارش کی ننھی ننھی سرد بوندیں من میں عجیب سے جذبات ابھار رہی تھیں۔ وہ وین میں حدید کے برابر آ کر بیٹھی تو اک سرشاری کی لہر سارے بدن میں سرایت کرگئی حدید نے گاڑی اسٹارٹ کردی تھی۔ وہ خاموش بیٹھی رہی۔ ابھی وہ لوگ چند کلومیٹر ہی طے کر پائے تھے جب اچانک عبیرہ نے اس کے ہاتھوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

''گاڑی روکیں پلیز۔'' وہ چونکا تھا نہ حیران ہوا تھا تاہم اس نے گاڑی روک دی۔

''مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔''

''کہیے۔'' عبیرہ کی دیوانگی اس سے مخفی نہیں تھی پھر بھی وہ بے نیازی دکھا رہا تھا وہ رو ہی تو پڑی۔

''میں آپ کو پسند کرتی ہوں اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہتی ہوں مگر آپ کی بے نیازی اور بے رخی مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔''

''آپ جو چاہتی ہیں وہ نہیں ہوسکتا۔'' اسے روتے پا کر بھی اس نے نگاہیں سامنے سڑک پر مرکوز رکھی تھیں۔ وہ تڑپ اٹھی۔

''کیوں، کیوں نہیں ہوسکتا؟''

''کیونکہ میری اور آپ کی حیثیت میں بہت فرق ہے۔''

''میں ان باتوں کو نہیں مانتی۔''

''جس معاشرے میں آپ رہتی ہیں وہ معاشرہ مانتا ہے۔''

''مجھے معاشرے کی پروا نہیں۔''

''مجھے ہے۔''

''آپ کو معاشرے کی پروا ہے میری نہیں؟'' وہ ہرٹ ہوئی تھی حدید نے گاڑی اسٹارٹ کرلی۔

''لڑکیاں پاگل ہوتی ہیں ان کی باتوں پر نہیں جانا چاہیے۔''

''میں پاگل نہیں ہوں۔''

حدید کے رویے نے اسے تکلیف پہنچائی تھی۔ وہ بے نیاز بنا خاموشی سے گاڑی ڈرائیو کرتا رہا۔

عبیرہ گھر آ کر بہت روئی تھی زندگی میں پہلی بار کسی نے اسے اس کی تمام تر خوبیوں سمیت ری جیکٹ کردیا تھا

اگلے تین چار روز تک وہ تیز بخار میں جلتی رہی۔ اس دوران اس کے ماں باپ کتنے پریشان رہے وہ بخوبی محسوس کرسکتی تھی۔

تقریباً ایک ہفتے بعد اس کی طبیعت بہتر ہوئی تو اسے کالج جانے کی پرمیشن ملی سادا سی تیار ہوکر وہ گھر سے نکلی تو اس کے بابا وین منگوا چکے تھے۔ آج وین میں سب سے پہلے سوار ہونے والی وہی تھی اور ڈرائیونگ سیٹ پر جو شخص بیٹھا تھا اسے دیکھ کر وہ حیران رہ گئی تھی۔ ہلکی ہلکی بڑھی ہوئی شیو کے ساتھ وہ اتنا ٹوٹا بکھرا دکھائی دے رہا تھا کہ عبیرہ کو اپنی بصارتوں پر یقین ہی نہ آیا۔ چھٹی کے بعد اس نے جان بوجھ کر سب لڑکیوں کو پہلے ڈراپ کیا پھر گاڑی عبیرہ کے گھر والے روڈ پر ڈال دی۔ ابھی گاڑی نے چند فرلانگ کا فاصلہ بھی طے نہیں کیا تھا جب ایک جھٹکے سے حدید نے گاڑی روک دی۔

"اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟" اسٹرینگ پر ہاتھ رکھے اس نے سامنے روڈ کی طرف دیکھتے ہوئے ہی اس سے پوچھا تھا جب وہ بولی۔

"ٹھیک ہے۔"

"مجھ سے ناراض ہیں آپ؟"

"نہیں۔"

"پھر میں اتنا بے چین کیوں ہوں، پچھلے ایک ہفتے سے مجھے کوئی چیز کیوں اچھی نہیں لگ رہی، میرا دل کیوں جل رہا ہے؟" اس بار وہ چونکی تھی اور اس کے چہرے پر جیسے سینکڑوں پھول کھلے تھے اس کی دعائیں مستجاب ہوگئی تھیں تبھی حدید کا ہاتھ تھامتے ہوئے وہ رو پڑی۔

"میں مرجاؤں گی آپ کے بغیر۔"

"اور مجھے لگتا ہے اگر میں نے دل پر مزید بند باندھے تو شاید میں زندہ نہیں رہ پاؤں گا۔" گمبھیر لہجے میں وہ کہہ رہا تھا اور عبیرہ جیسے نہال ہوگئی تھی تبھی وہ بولا تھا۔

"میرا اس دنیا میں کوئی بھی نہیں ہے جو چند خون کے رشتے تھے وہ بھی سیلابی پانی میں بہہ کر سمندر کی آغوش میں جا سوئے اب کوئی نہیں ہے جو میری فکر کرے میں رات گئے تک گھر نہ لوٹوں تو میری راہ دیکھے بھوکا سو جاؤں تو میری پروا کرے میرے لیے پریشان ہو، میرے سکھ دکھ بانٹے میں ہنسوں تو میرے ساتھ ہنسے اور میں روؤں تو مجھے اپنی بانہوں میں سمیٹ لے۔

❀ .... ❀ .... ❀

بے تحاشا پیار دینے کا جو وعدہ اس نے کیا تھا وہ اسے بخوبی نبھا رہا تھا۔ تاہم عبیرہ کبھی کبھی اس کے پیار کی شدتوں سے گھبرا کر اس کے کشادہ سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہہ بیٹھتی۔

"پلیز حدید، اتنا پیار نہ کیا کریں جانے کیوں تقدیر سے ڈر لگنے لگتا ہے۔ آپ کے پیار کی یہ شدت دل کو جیسے جکڑ لیتی ہے۔" اور وہ اس کے تفکر پر ہلکے سے مسکرا کر اس کے گال پر ہلکی سے چٹکی کاٹتے ہوئے کہتا۔

"پاگل لڑکی مجھ ہمیشہ تمہارے سنگ تمہارا ہی رہنا ہے ایویں فضول وسوسوں کی پروا مت کیا کرو۔" مگر اس نے اپنا وعدہ وفا نہیں کیا تھا۔ عائشہ کے دو سال بعد اس نے صحت مند بیٹے کو جنم دیا تو حدید اس کے ہاتھ چومتے ہوئے رو پڑا۔

"عبیرہ آج تم نے میرا دامن خوشیوں سے بھر دیا ہے میرا بیٹا، میرا شیر آ گیا دنیا میں میری پہچان بنانے کو، اب تو مجھے دن رات لگاتار کام بھی کرنا پڑا تو میں کروں گا اپنے بچوں کو دنیا کی ہر خوشی ہر عیش دوں گا یہ وعدہ ہے میرا تم سے اور خود اپنے آپ سے سچ کہتا ہوں آج میں اتنا خوش ہوں کہ اب تقدیر سے اور کسی چیز کی خواہش نہیں رہی۔" اس نے کہا تھا اور غلط کہا تھا۔

اسے تقدیر سے اپنی زندگی اور اپنے رشتوں کی دائمی خوشیوں کی دعا مانگنی چاہیے تھی۔ اس روز وہ صبح ہی صبح بیدار ہوکر صحن میں اینٹوں سے بنے چولہے کے قریب چلی آئی تھی۔ حمزہ اس وقت ایک سال کا جبکہ عائشہ تین سال کی تھی۔

ٹھٹھرتے موسم کی وہ اداس صبح اسے کبھی نہیں بھولتی تھی جب اسے چولہے کے قریب آگ جلاتے دیکھ کر حدید

بھی گرم بستر سے نکل آیا تھا اور اب آگ جلانے میں اس کی مدد کررہا تھا۔

"اف کتنی سردی ہے آج اور تم نے کوئی گرم شال بھی نہیں لی مرنے کا ارادہ ہے کیا؟" آگ جلا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے پوچھا تو وہ مسکرادی۔

"ہوں، آپ کے لیے اچھا ہی ہے نا کوئی نئی نویلی دلہن مل جائے گی۔"

"جسٹ شٹ اپ۔" وہ خفا ہوا تھا اور اٹھ کر اندر کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا۔ عبیرہ مسکراتے ہوئے اس کے پیچھے چلی آئی۔

"کیا ہوا۔ برا لگا؟"

"ہاں، میری زندگی میں دوبارہ کبھی ایسی بات مت کرنا عبیرہ میری دنیا میری زندگی میری جنت تم سے اور میرے ان معصوم پھولوں سے ہے میں ماسٹرز کا ڈگری ہولڈر ہو کر بھی ٹیکسی چلاتا ہوں کوئی غم نہیں میرے پاس کوئی محل کوئی خزانہ کوئی رشتہ نہیں آئی ڈونٹ کیئر، بس میں...... میں تمہیں ایک پل کے لیے بھی نہیں کھونا چاہتا عبیرہ، زندگی نے جو دکھ اور محرومیاں میری جھولی میں ڈالی ہیں میں وہ درد اور محرومیاں اپنے بچوں کی آنکھوں میں پلتے ہوئے نہیں دیکھنا چاہتا۔ تم دیکھنا بہت جلد ہم یہ چھوٹا سا ٹوٹا پھوٹا گھر بیچ کر کسی اچھے سے پوش ایریا میں خوب صورت گھر بنائیں گے اپنے ایک دوست کے پاس دو کمیٹیاں ڈالی ہیں میں نے ان شاء اللہ وہاں ہمارے بچے بہترین زندگی گزاریں گے میرا وعدہ ہے تم سے، میں سب کچھ کرلوں گا بس تم میرا ساتھ دینا کبھی مجھ سے دور نہیں جانا۔" وہ جذباتی ہوا تھا عبیرہ کو اس پر ٹوٹ کر پیار آیا۔

ہر روز کی مانند اس روز بھی وہ بچوں کو لے کر ہنستے مسکراتے اسے خوب تنگ کرتے ہوئے جلد گھر واپس لوٹنے کے وعدے کے ساتھ گھر سے روانہ ہوا تھا مگر دوپہر سے عصر ڈھلی عصر سے مغرب ڈھلی عائشہ ٹیوشن سے اکیلی گھر واپس آگئی مگر وہ نہ آیا کہ جس کی بے پروائی پر وہ اس سے خوب جھگڑا کرنے کا قصد کیے بیٹھی تھی۔ اسی روز عشاء کے قریب اسے حدید کے روڈ ایکسیڈنٹ کی خبر ملی۔ سر پر اچانک آسمان کیسے ٹوٹتا ہے قدموں تلے سے زمین کیسے کھسکتی ہے اوسان خطا ہونا حقیقت میں کیا ہوتا ہے اس روز اسے پتا چلا تھا۔

شدید سرد موسم میں چادر سے بے نیاز، جب وہ عائشہ اور حمزہ کو لے کر پیدل بھاگتی ہوئی اسپتال پہنچی تھی جہاں اس کا حدید شدید تکلیف میں تھا۔ اسپتال کے سرد فرش پر کپکپاتی ٹانگوں سے بمشکل اپنا بوجھ سہارے وہ حدید کو تلاش کررہی تھی۔ جب وہ اسے ایک کونے میں شدید زخمی حالت میں اسٹریچر پر پڑا دکھائی دے گیا جانے کون اسے وہاں لا کر پھر خود فرار ہو گیا تھا وہ تڑپ گئی۔

تیکھے نین نقوش والا اس کا رومینٹک سا خوبرو شہزادہ کہ جس کے لب کبھی ہنسنا نہیں بھولتے تھے اس وقت بے بس سا خون میں لت پت پڑا تھا۔ کسی مسیحا کے پاس اتنی فرصت نہیں تھی کہ اس کی زندگی بچانے کی کوشش کرتا۔ شہر کے کسی رئیس نے شراب کے نشے میں اس غریب ٹیکسی ڈرائیور کو کچل کر زندگی اور موت کے مابین لٹکتی اذیت کے سپرد کرڈالا تھا۔

بے بسی اور بے حسی کی انتہا تھی اس پر انسانیت کے مسیحاؤں کا حوصلہ شکن رویہ وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے ساکت کھڑی دیکھتی رہ گئی تھی۔ وہ جو اس کی زندگی تھا وہ اس کے لیے کچھ بھی نہیں کر پارہی تھی۔ اس روز اس لمحے وہ کتنی تکلیف میں تھی کاش کوئی جان پاتا۔ حدید کی حالت پر درد سے بلکتے ہوئے اس نے ایک ایک فرد کے آگے ہاتھ جوڑے تھے مگر کسی نے اس کی مدد نہیں کی تھی کسی نے اس کے آنسوؤں کا کرب جاننے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ کسی نے اس کی دلخراش چیخوں پر کان نہیں دھرے تھے وہ تڑپ رہی تھی مگر کسی نے اس کا درد نہیں سمجھا تھا کسی نے اس کی زندگی کے کل اثاثے اس کے واحد سہارے اس کے محبوب شوہر کی آنکھوں میں زندہ رہنے کی خواہش کو نہیں دیکھا تھا معاشرے کی بے حسی نے اس

کی دنیا اجاڑ دی۔

اس کے پاس اس وقت اتنے پیسے بھی نہیں تھے کہ وہ اپنے محبوب شوہر کے لیے کفن خرید سکتی اتنا ہوش بھی کہاں تھا آنکھوں کے سامنے ریشمی بالوں اور ستاروں سی روشن غلافی آنکھوں والا شہزادہ خاموش لیٹا ابدی نیند سو رہا تھا اور وہ ساکت بیٹھی بے حس و حرکت دیوانہ وار اسے دیکھے جا رہی تھی۔ ہمیشہ ساتھ نبھانے کا وعدہ کرنے والا وہ شخص چند سال بھی ساتھ نہیں چل سکا تھا بے تحاشا پیار کرنے والا آج زیست کی کٹھن راہ پر اسے اکیلا کر کے جا رہا تھا۔ معصوم عائشہ اپنے باپ کے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے رو رہی تھی اس کے گالوں کو چوم رہی تھی خود حمزہ ماں کی گود میں مچل رہا تھا جبکہ تیسرا وجود جو ابھی اس کے پیٹ میں پل رہا تھا اسے تو خبر بھی نہیں تھی کہ زندگی نے اس کے ساتھ کیسا بے رحمانہ کھیل کھیلا ہے وہ جو اپنے بچوں کی آنکھ میں ایک آنسو نہیں دیکھ سکتا تھا اس وقت ایک پل کے لیے ابدی نیند سے جاگ کر اپنے جگر گوشوں کو رونے سے منع بھی نہ کر پایا۔

زندگی اپنی پوری ہولناکی کے ساتھ اب اس کے سامنے آئی تھی۔ قرب و جوار کے امیر لوگوں نے کفن دفن کا انتظام کر کے اس کے شہزادے کو مٹی کے سپرد تو کر دیا تھا مگر اس کے بعد وہ عبیرہ اور اس کے بچوں کے ساتھ مستقل ہمدردی سے بے بہرہ ہو گئے شاید مصروف زندگی میں کسی کے پاس بھی ایک غریب ٹیکسی ڈرائیور کی بیوہ پر توجہ دینے کی فرصت نہیں تھی۔

دن ہفتوں، ہفتے مہینوں میں اور مہینے سالوں میں بدلتے چلے گئے وہ بے آسرا سی اپنی ذات کو مار کر اپنے اندر ہی دفن کرنے کے بعد اپنے جگر گوشوں کی زندگی کے لیے لوگوں کے گھروں میں کام کرنے لگی۔ مگر گزرتے وقت کے ساتھ وہ مختلف بیماریوں کی لپیٹ میں آتی چلی گئی تھی۔ حدید کی جدائی نے اسے اندر سے کھوکھلا کرنا شروع کر دیا تھا۔ آئے روز وہ بخار کی لپیٹ میں رہتی۔ عائشہ جیسے جیسے بڑی ہوئی اس نے گھر کے کاموں میں عبیرہ کا ہاتھ بٹانا شروع کر دیا ماں کی غیر موجودگی میں وہ دونوں بھائیوں کا خیال بھی رکھتی تھی۔

بستہ اسکول کتابیں سب باپ کی وفات کے ساتھ ہی جیسے خواب ہو گئی تھیں اب تو زندگی کی بے حسی اور تلخیاں تھیں اور اس کا ننھا سا دماغ......

عبیرہ نے ابتدا میں جس کوٹھی میں کام کرنا شروع کیا وہ بہت اچھے لوگ تھے انہوں نے نا صرف اسے سر چھپانے کو جگہ دی بلکہ دو وقت کا کھانا معقول تنخواہ کپڑے وغیرہ بھی دے دیتے تھے اکثر وہ بیمار پڑ جاتی تو دوا دارو بھی منگوا کر دیتے مگر چار سال کے بعد وہ ملک سے باہر شفٹ ہو گئے تو وہ پھر در بدر ہو گئی دوسری بار اس نے جس گھر میں نوکری کی اس گھر کے مالک کی نظر اس پر خراب تھی۔ وہ بڑی مشکل سے ایک روز اپنی عزت بچا کر وہاں سے بھاگی اٹھارہ دن کی تنخواہ سے بھی ہاتھ دھوئے۔

زندگی گزرتے ہر دن کے ساتھ جیسے تلخ سے تلخ ترین ہوتی جا رہی تھی۔ ایسے میں جوڑوں کے درد نے اسے نئی مصیبت میں مبتلا کر دیا کئی بار اسی مرض کی وجہ سے وہ نوکری سے فارغ ہوتی رہی اچھی تعلیم کے باوجود صرف چند کاغذی اسناد کے نہ ہونے کے سبب اسے ٹکے ٹکے کی نوکری کے لیے در در کے دھکے کھانے پڑ رہے تھے۔ مناسب علاج نہ ہونے کے سبب مرض بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ ادھر محلے میں جو قریبی ڈاکٹر تھا اس کے اندر کی ہوس کھل کر سامنے آ گئی تھی۔ ہمدردی کی آڑ میں پہلی بار جب اس نے عبیرہ کا ہاتھ پکڑا وہ اسی روز جان گئی کہ اس کی ہمدردی کی اصل وجہ کیا تھی بیوی کی موت کے بعد کمزور عورتوں پر ہاتھ صاف کرنا اس نے اپنا مشغلہ بنا لیا تھا تبھی عبیرہ نے اس کے پاس جانا چھوڑ دیا۔

اس کا چھ سالہ بیٹا حمزہ گھر سے باہر کھڑا جب محلے کے بچوں کو کندھے پر بیگ لٹکائے اسکول جاتے دیکھتا تو حسرت و یاس کا شکار ہو کر روز روتے ہوئے اس سے اسکول جانے کی ضد کرتا مگر وہ روز اسے ٹال دیتی اب وہ اس ننھے سے پھول کو کیا بتاتی کہ زندگی جب بے رحمی کا

لبادہ اوڑھ لے تو زندہ رہنے کا بھرم رکھنا بھی مشکل ہو جاتا ہے اسکول جانا تو بہت بڑی بات تھی۔

حدید اپنے بچوں کی فرمائشوں کا کتنا خیال رکھتا تھا۔ کیسے ان کے ایک آنسو پر تڑپ اٹھتا تھا مگر اب وہ حالات نہیں رہے تھے اب زندگی کے اختیار پر آزمائشوں کی دھند چھا گئی تھی اور یہ آزمائش اس اکیلی لڑکی کو ہر قدم پر توڑ کر بکھیر رہی تھی۔

سر سے شوہر کا سایہ کیا اٹھا وہ جیسے ساری دنیا کے سامنے بے پردہ ہوگئی۔

اس نے حدید سے کہا تھا کہ وہ اسے مرنے نہیں دے گی مگر وہ اب خود کو مرنے سے نہیں بچا پا رہی تھی پورا وجود درد کی لپیٹ میں تھا مگر اس کے پاس اتنے پیسے بھی نہیں تھے کہ وہ اس درد سے چھٹکارے کی دوا ہی خرید پاتی۔ حدید کی زندگی اس کے لیے بہت ضروری تھی اور اس کی زندگی اس کے بچوں کے لیے بہت ضروری تھی مگر سوال ضرورت کا نہیں پیسوں کا تھا موت یہ کبھی نہیں دیکھتی کہ کس کی زندگی کس کے لیے کتنی ضروری ہے وہ تو بس چھیننا جانتی ہے دلوں میں ہولناک سناٹوں کا پڑاؤ ڈالنا جانتی ہے۔

''ماں، ہمیں کھانا کب ملے گا؟'' اسے پلکیں موندتے دیکھ کر ننھے طلحہ نے اس کا بازو ہلایا تھا عبیرہ کے اندر جیسے کوئی چیخ اٹھا، بھلا انسانیت کی اس سے بڑھ کر بھی کوئی تذلیل ہوتی تھی؟

اس کے بچے بھوک سے تڑپ رہے تھے اور اردگرد تعمیر بڑی کوٹھیوں کے پتھر دل لوگوں کو اس کی خبر تک نہیں تھی جبکہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے وہ شخص ہم میں سے نہیں جس کے پہلو میں اس کا ہمسایہ بھوکا سوتا رہا اور وہ خود پیٹ بھر کر کھانا کھالے۔ وہ لوگ شاید اس اسلامی معاشرے کے لوگ نہیں تھے شدید بخار اور نقاہت کے باعث اس کی آنکھوں کے پپوٹے بھی کھلنے سے معذوری ظاہر کر رہے تھے گرم گرم سیال نگینے خود اپنے ہی حال پر ماتم کناں پلکوں سے ٹوٹ کر گالوں پر بکھرتے چلے گئے تھے اللہ رب العزت کی اتنی بڑی کائنات میں کوئی نہیں تھا جو ان معصوم پھولوں پر ترس کھا کر رحم کرتا انہیں دو وقت کا کھانا مہیا کرتا یا اللہ کے نام پر اتنے پیسے ہی بھجوا دیتا کہ جس سے وہ اپنے بچوں کے لیے کچھ خرید کر انہیں کھلا سکتی۔ نفسانفسی اور بے حسی کے دور میں کسی بھی رئیس یا صاحب حیثیت شخص یا گھرانے کو اس خوب صورت جوان بیوہ عورت کے بچوں کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں تھی ہاں اس کی تنہائی پر شکوک وشبہات بہت تھے۔

ایک اسلامی معاشرے میں بے مثال نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی امت ہو کر ان لوگوں کی سوچ اور طرز زندگی خالصتاً غیر اسلامی تھا تبھی بمشکل اس نے آنکھیں کھولی تھیں اور اپنی طبیعت کی خرابی کی پروا کیے بغیر صرف اپنے بچوں کی تسلی کے لیے بمشکل وہ اٹھ کر بیٹھ گئی عائشہ جو محض آٹھ سال کی عمر میں اپنے چھوٹے بھائیوں کی ماں کے فرائض سرانجام دے رہی تھی۔ بھاگ کر اس کے لیے پانی لے آئی، عبیرہ نے پانی پیا تو اس کے حواس کچھ بہتر ہوئے تبھی حمزہ نے اس کے گھٹنے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے معصومیت سے بتایا۔

''امی...... آپ کو پتا ہے کل بڑی عید ہے عاشی آپی کہتی ہیں آپ ہمارے لیے بھی گوشت پکائیں گی مجھے گوشت بہت اچھا لگتا ہے آپ کل ہمارے لیے گوشت پکائیں گی ناں امی؟'' وہ ابھی اسے جواب بھی نہ دے سکی تھی کہ اس سے چھوٹا طلحہ بول اٹھا۔

''ماں، کل عید پر سارے بچے اچھے اچھے کپڑے پہنیں گے مگر ہمارے پاس تو کھانا بھی نہیں ہے کیا اللہ میاں نے صرف اچھے بچوں کے لیے عید بنائی ہے، کیا ہمارے لیے عید نہیں ہوگی؟ کیا جن بچوں کے پاس اچھے کپڑے نہیں ہوتے ان کی عید نہیں ہوتی۔''

''ہاں ماں، وہ سامنے عامر کا گھر ہے نا، اس کے ابو کل ایک بڑا سا بکرا لے کر آئے ہیں میں نے بھی دیکھا بہت پیارا ہے مگر وہ مجھے اس سے کھیلنے نہیں دے رہا اور پتا ہے

ان کی ممانے ان کے لیے بہت پیارے پیارے کپڑے بنائے ہیں مگر دیکھیں میرے کپڑے کتنے پرانے ہیں اور میرا جوتا بھی پھٹ گیا ہے مگر ہمیں اچھے جوتے اور کپڑے نہیں چاہیے ہمیں صرف کھانا چاہیں صرف ایک روٹی لادیں ہم پانی کے ساتھ کھالیں گے۔"

محض آٹھ سال کی عمر میں ننھے حمزہ اور صرف پانچ سال کی عمر میں ننھے طلحہ کی آنکھوں میں اس قدر التجا تھی کہ وہ بلبلا اٹھی تھی حدید نے کہا تھا۔

"تم دیکھنا عبیرہ میں اپنے بچوں کو زندگی میں کبھی کسی چیز کے لیے ترسنے نہیں دوں گا۔ بھلے میں ایک غریب ٹیکسی ڈرائیور سہی مگر میرے بچے شاہانہ زندگی بسر کریں گے تم دیکھنا دنیا میرے بچوں کے نصیب پر رشک کرے گی۔" مگر دنیا نے رشک کیا کرنا تھا رحم تک نہ کیا جو دو کمیٹیاں حدید نے ڈالی ہوئی تھیں ان کا ایک پیسہ بھی اسے نہ ملا اس کی جیب میں ایکسیڈنٹ کے بعد جتنے بھی پیسے تھے سب لوگوں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر نکال لیے تھے اور آج یہ حال تھا کہ اس کے بچے قیمتی کتابوں یا کھلونوں کے لیے نہیں بلکہ روٹی کے لیے ترس رہے تھے رو رہے تھے دعائیں کر رہے تھے اس کا جگر نہ پھٹتا تو اور کیا ہوتا؟

اس وقت حمزہ اور طلحہ کو اپنے سینے میں بھینچ کر وہ خوب روئی تھی۔

"نہیں، میں اپنے بچوں کو بھوکا نہیں دیکھ سکتی میں انہیں ایک رات اور بھوکا نہیں سونے دوں گی۔" ننھے پھولوں کو سینے میں بھینچے اس نے جیسے خود سے عہد کیا تھا پھر اپنی چادر سنبھالتی بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی سارا بدن گویا آگ میں جل رہا تھا۔ سانسیں اکھڑ رہی تھیں ریشمی بال بکھر کر گردن سے چپک گئے تھے بے حد کمزوری کے باعث اسے زور کا چکر آیا تھا مگر عائشہ نے اسے سنبھال لیا۔

"حمزہ طلحہ تم دیکھ نہیں رہے امی کی طبیعت ٹھیک نہیں، کیا ایک رات اور صبر نہیں کر سکتے صبح گوشت آ جائے گا۔"

"نہیں، امی ٹھیک ہے بیٹے آپ بھائیوں کا خیال رکھنا میں ابھی آپ لوگوں کے لیے کھانا لے کر آتی ہوں۔" عائشہ کی تڑپ پر اس نے اسے پیار کرتے ہوئے تسلی دی پھر تینوں بچوں کو بانہوں میں بھینچ کر اپنی چادر اچھی طرح اپنے وجود کے گرد لپیٹتے ہوئے وہ گھر سے باہر نکل آئی۔ کراچی کے حالات خراب تھے انسان دشمن بے ضمیر حیوانوں نے شہر میں خوف وہراس قائم کر رکھا تھا مگر اسے کسی بات کی پروا نہیں تھی۔

وہ ماں تھی اور قدرت اس کی ممتا کا امتحان لے رہی تھی۔ اسے اس امتحان میں ہر صورت سرخرو ہونا تھا شہر کے بڑے بڑے رفاہی ادارے بڑی بڑی نامور این جی اوز اس کے اور اس کے بچوں کے کسی کام کی نہیں تھیں کرب وذلت کے احساس سے اس کی آنکھیں بار بار دھندلا رہی تھی حلق میں جیسے غم کا پھندہ سا پڑ کر رہ گیا تھا شہر کے چوراہے کی طرف بڑھتے شکستہ قدموں سے اس کے ذہن میں صرف ایک ہی سوال گونج رہا تھا۔

"ماں، ہمیں کھانا کب ملے گا؟"

حدید اگر زندہ ہوتا تو کیا اس ایک جملے کے لیے اسے معاف کرتا، دو دن سے وہ بخار میں بے ہوش پڑی تھی تو اس کے بچوں کا کیا قصور تھا جن کے ننھے پیٹ بھوک کی تکلیف برداشت کر رہے تھے اسے خود پر غصہ آ رہا تھا تبھی شہر کے چوراہے پر خشک لبوں پر بمشکل زبان پھیرتے ہوئے اس نے زندگی میں پہلی بار اللہ کے بندوں کے سامنے ہاتھ پھیلایا تھا۔

"اللہ کے نام پر کچھ دے جا بابا...... صرف ایک روپے کا سوال ہے بابا۔" گزرتے ہر لمحے کے ساتھ اس کی آواز بلند ہوتی جا رہی تھی اسے قدرت کی طرف امتحان میں سرخرو ہونا تھا تبھی بدکردار گھٹیا ڈاکٹر کی دعوت قبول کرنے کی بجائے اس نے بھیک کی ذلت گوارا کر لی تھی۔

شام کے دھندلکے رات کی تاریکی میں ڈھلنے لگے تھے تیز بخار میں جلتے آنسوؤں کے ساتھ چوراہے پر ایک طرف کھڑی وہ بڑی کربناک صدائیں دے رہی تھی تبھی

اس کی جھولی میں کئی سکے جمع ہوگئے تھے کوئی بھیک دے رہا تھا تو کوئی میلی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا کچھ منچلے نوجوان موٹر سائیکل پر کافی دیر سے سیٹیاں بجاتے ہوئے اس کے گرد چکر لگاتے رہے تھے مگر اسے کسی بات کا ہوش ہی کہاں تھا۔ آج وہ ایک عورت کہاں رہی تھی آج تو وہ ایک ماں بن کر گھر کی دہلیز سے شہر کے چوراہے تک آئی تھی۔ لوگوں کی میلی نظروں سے قطع نظر اس نے ایک مسرت بھری نظر اپنی جھولی میں جمع ہوئے سکوں پر ڈالی تو جھلملاتی اداس نگاہوں میں ایک دم سے خوشی کے دیپ جل اٹھے۔ بے ساختہ اس نے تشکر بھری نگاہوں سے اوپر آسمان کی طرف دیکھا۔

''یا اللہ، تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تو نے میرے بھوکے بچوں کے لیے رزق کا وسیلہ فراہم کردیا۔ میں اب کبھی اپنے بچوں کو بھوکا نہیں رہنے دوں گی۔ سب بچوں کی طرح میرے بچے بھی ہر رات پیٹ بھر کر سوئیں گے کل زیادہ بھیک ملی تو میں طلحہ کے لیے نیا جوتا اور حمزہ کے لیے گوشت بھی خریدوں گی۔''

تانبے کے سکوں کو مضبوطی سے مٹھی میں دبائے وہ نجانے کیا کیا پلان ترتیب دے رہی تھی تبھی اس نے تیزی سے چوراہے سے بازار کا رخ اختیار کیا تھا اپنے معصوم بچوں کے لیے روٹی، پھل، ٹافیاں خریدتے ہوئے اس کے چہرے کی خوشی دیدنی تھی۔ اس کا بس نہ چلتا تھا کہ وہ اڑ کر اپنے بچوں کے پاس پہنچ جائے اور ان کی آنکھوں میں جلتے مسرت کے دیپ دیکھے دونوں ہاتھوں میں مختلف اشیا کے شاپرز سنبھالے وہ بڑے سرشار انداز میں تیزی سے سڑک کراس کرتے ہوئے ابھی وہ گھر کے قریب ہی پہنچی تھی کہ جب اچانک کسی طرف سے موٹر سائیکل پر سوار تین نقاب پوش لڑکے سرعت سے سامنے آئے اور وہاں چلتے پھرتے لوگوں پر بنا کچھ دیکھے اندھا دھند فائرنگ شروع کردی۔

تیزی سے ادھر ادھر بھاگتے خوف و ہراس کے شکار لوگوں کے بیچ اس کا نڈھال سا وجود لڑکھڑا کر رہ گیا تھا۔ انسان دشمن بے ضمیر حیوانوں کی خونی کلاشنکوف سے نکلنے والی ایک گولی اس کے پیٹ میں لگی تھی اور وہ درد سے چیختے ہوئے وہیں گر پڑی۔ اس کے لاغر ہاتھوں میں مضبوطی سے پکڑے شاپر چھوٹ کر دور جا گرے تھے۔ جلتی ہوئی کربناک نگاہوں میں وہی پیاس ہلکورے لے رہی تھی جو اس نے حدید کی آنکھوں میں دیکھی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے لوگوں کا جم غفیر اکٹھا ہوگیا تھا روشنیوں کے شہر میں دہشت گردی کی شکار وہ بے بس لڑکی جسے وقت نے عمر سے پہلے ہی توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا اپنی تیزی سے بند ہوتی نگاہوں میں ڈھیروں آنسو لیے اپنے جگر گوشوں کی منتظر تھی۔

وہ جانتی تھی اگلے روز کے اخبارات اور ٹیلی ویژن چینلز میں مرنے والوں کی موت کا ڈھنڈورا پیٹا جائے گا صدر وزیراعظم، وزرا سب واقعہ کی مذمت کریں گے مگر کسی اخبار، کسی ٹی وی چینل پر اس کے بچوں کی بھوک اور بے بسی کا کوئی تذکرہ نہیں ہوگا۔ کوئی ان کے درد اور آنسوؤں کا ذکر نہیں کرے گا۔

اگلے دس منٹ میں اس کے بچے اس کے پاس آگئے تھے ننھی عائشہ اپنی ماں کے وجود سے نکلتا خون دیکھ کر رو رہی تھی۔ چیخیں مار رہی تھی۔ حمزہ بھی بھوک کی تکلیف بھلائے بلک بلک کر رو رہا تھا مگر...... ان دونوں سے قطع نظر، پانچ سالہ طلحہ ہجوم سے نگاہیں چرا کر کچھ ہی فاصلے پر سڑک پر بکھرے مختلف اشیا کے شاپرز میں سے چیزیں نکال کر کھا رہا تھا کہ اس وقت اس کی بھوک کی تکلیف اس کے لیے اس کی ماں کی ہونے والی متوقع موت کی تکلیف سے کہیں بڑھ کر تھی۔